ادب کیا ہے

یہ سوال اکثر پوچھا جاتا ہے کہ "ادب" کیا ہے؟ اس کا جواب دینے سے پہلے اگر میں آپ سے یہ سوال کروں کہ "زندگی" کیا ہے تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جو جواب بھی آپ دیں گے، وہ جامع نہیں ہوگا۔ اس میں صرف وہ زاویہ ہوگا جس سے خود آپ نے زندگی کو دیکھا ہے یا دیکھ رہے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ دوسرا بھی اس سے اتفاق کرے یا آپ کے جواب سے مطمئن ہو جائے۔ یہ سوال بھی کہ ادب کیا ہے، اسی نوعیت کا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود ادب بھی "زندگی" کے اظہار کا نام ہے۔ ادب چونکہ لفظوں کی ترتیب و تنظیم سے وجود میں آتا ہے اور ان لفظوں میں جذبہ و فکر بھی شامل ہوتے ہیں اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ لفظوں کے ذریعے جذبے، احساس یا فکر و خیال کے اظہار کو ادب کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی تعریف ہے جس میں کم و بیش ہر وہ بات جس سے کسی جذبے، احساس یا فکر کا اظہار ہوتا ہے اور جو منہ یا قلم سے نکلے، ادب کہلائے گی۔ لیکن میری طرح یہ آپ بھی جانتے ہیں کہ ہر وہ بات، جو منہ سے نکلتی ہے یا ہر وہ بات جو قلم سے ادا ہوتی ہے، ادب نہیں ہے۔ عام طور پر اخبار کے کالم یا اداریئے ادب نہیں کہلاتے حالانکہ ان میں الفاظ بھی ہوتے ہیں اور اثر و تاثیر کی قوت بھی ہوتی ہے۔ ہم سب خط لکھتے ہیں لیکن ہمارے خطوط ادب کے ذیل میں نہیں آتے لیکن اس کے برخلاف غالب

ے یہ مضمون اطہر نفیس مرحوم کے سوال کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

کے خطوط ادب کے ذیل میں آتے ہیں۔ غالب اور دوسرے خطوط کے فرق کو دیکھتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایسی تحریر کو ادب کہا جا سکتا ہے جس میں الفاظ اس ترتیب و تنظیم سے استعمال کئے گئے ہوں کہ پڑھنے والا اس تحریر سے لطف اندوز ہو اور اس کے معنی سے مسرت حاصل کرے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب لفظ و معنی اس طور پر گھل مل گئے ہوں کہ ان میں "رس" پیدا ہو گیا ہو۔ یہی رس کسی تحریر کو ادب بناتا ہے۔ اس مسرت کا تعلق ہمارے باطن میں چھپے ہوئے اس احساس سے ہوگا جس کو اس تحریر میں پاکر ہم مسرت محسوس کرتے ہیں اور ان معنی سے بھی ہوگا جس کا ہمیں ادراک ہوا ہے۔ یہ وہ تحریر ہوگی جس نے ہمارے شعور اور ہمارے تجربوں کے خزانے میں اضافہ کیا ہے اور ان دیکھے تجربات سے اس طرح مانوس کر دیا ہے کہ وہ تجربے ہمارے اپنے تجربے بن گئے ہیں۔ یہ وہ تحریر ہوگی جس کا اثر وقتی اثر کا حامل نہیں ہوگا بلکہ اس میں ابدیت ہوگی اور جو زمان و مکان سے آزاد ہو کر آفاقیت کی حامل ہوگی۔ انہیں خصوصیات کی وجہ سے مثنوی مولانا روم، دیوان حافظ، کلام غالب، اشعارِ میر، تخلیقاتِ شیکسپیئر اور مکالماتِ افلاطون ہمیں آج بھی متاثر کرتے ہیں اور ہمارے تجربات و شعور میں احساسِ مسرت کے ساتھ اضافہ کرتے ہیں۔ جس تحریر میں بیک وقت یہ سب خصوصیات موجود ہوں گی وہ تحریر ادب کہلائے گی اور جتنی زیادہ یہ خصوصیات ہوں گی وہ تحریر اسی اعتبار سے عظیم ادب کے ذیل میں آئے گی۔

ادب کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ ادب زندگی میں کسی چیز کا "بدل" نہیں ہے اور اگر اس کی حیثیت کسی اور چیز کے بدل کی ہے تو پھر وہ ادب نہیں ہے۔ ادب ایسا 'اظہار' ہے جو زندگی کا شعور و ادراک حاصل کرنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ادب میں انسان کے تخیلی تجربے کو ابھارنے کی ایسی زبردست قوت ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اس تجربے کا ادراک کر لیتا ہے۔ ادب میں متحرک کرنے اور ہماری روح میں موجود خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی غیر معمولی قوت ہوتی

ہے۔ ادب کے ذریعے ہم زندگی کا شعور حاصل کرتے ہیں۔ یہ ادب کا خاص منصب ہے۔ ادیب ایک ایسا انسان ہے جس میں ادراک کی صلاحیت بھی ہوتی ہے اور اس کے اظہار کی قوت بھی۔ اس کے ادراک و اظہار میں اتنی داخلی و خارجی وسعت اور تہ داری ہوتی ہے کہ ادب انفرادی و ذاتی ہوتے ہوئے بھی آفاقی ہوتا ہے۔ جتنا بڑا ادیب ہوگا اس کے تجربے کا تنوّع، اس کا شعور و ادراک اور اس کا اظہار اتنا ہی بڑا اور آفاقی ہوگا۔

ادب کے ذریعے، جیسا کہ میں نے کہا ہے، ہم دوسروں کے تجربوں میں شریک ہو جاتے ہیں اسی لیے ادب کی سطح پر ہم اپنی ذات سے بلند ہو جاتے ہیں۔ ادب عملِ ادراک کی غیر معمولی قوت کے ذریعے ہماری عام ہستی کو بیدار کر کے شعور کی ایسی سطح پر لے آتا ہے جو اس کے بغیر خفتہ رہتی۔ اگر ادب نہ ہوتا اور سعدی، میر، غالب، اقبال، حافظ، شیکسپیر، گوئٹے، دانتے وغیرہ نہ ہوتے تو انسان آج بھی معصوم بچّے کی طرح ہوتا۔ ادب کے ذریعے ہی ہم بلوغت کے درجے پر آتے ہیں۔ زندگی بسر کرتے ہوئے ہم پر بہت سے جذبے گزرتے ہیں، بہت سے ادھورے معنی ہمارے ذہن میں اُبھرتے، نامعلوم احساس سے ہمیں واسطہ پڑتا ہے، ہم میں بغاوت کا میلان پیدا ہوتا ہے لیکن یہ سب ہمارے لیے گونگے اور بے نام ہوتے ہیں اور یونہی گزر جاتے ہیں لیکن جب ان سے ہمارا واسطہ ناول، افسانے، شاعری، ڈرامے یا مضمون میں لفظوں کی حسین، پُررس اور جاندار ترتیب و تنظیم کے ساتھ پڑتا ہے تو ہم ان کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں اور یہ جذبے، یہ احساس، یہ میلان، یہ تجربے ہمارے شعور کا حصّہ بن جاتے ہیں اور اس طرح ہم زندگی میں نئے معنی تلاش کر لیتے ہیں۔

ادب زندگی میں نئے معنی تلاش کرنے کا نام ہے اور اسی لیے ادب زندگی کے شعور کا نام ہے۔ اسی شعور کے ذریعے ہم بدلتے ہیں۔ ہم وہ نہیں رہتے جو اس وقت ہیں اور اسی سے ہمارے اندر قوتِ عمل پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کے ایسے تجربے جن سے

ہمیں کبھی واسطہ نہیں پڑا، ادب کے ذریعے براہ راست ہمارے تجربے بن جاتے ہیں اور ہمیں اور ہمارے اندازِ فکر کو بدل دیتے ہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ادب کے ذریعے ہم دوسروں کے تجربوں میں اس طور پر شریک ہو جاتے ہیں کہ وہ ہمارے تجربے بن جاتے ہیں تو شاید یہ بات آپ کو پُراسرار سی معلوم ہو لیکن اسے ایک انتہائی مثال سے یوں سمجھئے کہ اپنی محبوبہ کو رقابت یا حسد کی شدت کے زیرِ اثر قتل کرنے کا تجربہ ہمارے لیے حاصل کرنا آسان نہیں ہے لیکن شیکسپیئر کے اوتھیلو کے ساتھ شریک ہو کر یہ تجربہ ہمارا اپنا تجربہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح لیڈی میکبتھ کا تجربہ میرا اپنا تجربہ بن جاتا ہے۔ فاؤسٹ کو پڑھ کر گوئٹے کے اور اینا کرینا، پڑھ کر ٹالسٹائی کے تجربات میرے تجربات بن جاتے ہیں۔ مولانا روم کی مثنوی اور گلستان و بوستان کے تجربے میرے اپنے تجربات بن جاتے ہیں۔ ادب کا یہی کام ہے۔

اب آپ یہاں یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ آخر کیا ہم ان تجربات کا ادراک کیے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً گزار سکتے ہیں لیکن یہ زندگی حیوانی سطح پر بسر ہوگی۔ اگر ہم زندگی کو صرف اپنے تجربات تک محدود کر لیں تو زندگی اندھا کنواں بن کر رہ جائے اور عین ممکن ہے کہ ہمارے تجربات کوئی خطرناک صورت اختیار کر لیں اور ہمارے اندر ایک ایسا عدم توازن پیدا ہو جائے جو زندگی کو آگے بڑھانے کے بجائے اُسے مثبت راستے سے ہٹا دے۔ ادب کے ذریعے جب دوسروں کے بے شمار چھوٹے بڑے تجربے ہمارے شعور و ادراک کا حصہ بنتے ہیں تو نہ صرف ہمارا تزکیہ (کیتھارسس) ہو جاتا ہے بلکہ اس سے زندگی کا توازن بھی درست رہتا ہے۔ عام تجربہ گونگا ہوتا ہے۔ ادیب اُسے زبان دے کر نہ صرف ہمیں اس کا ادراک کرا دیتا ہے بلکہ ہمارے باطن کو بھی روشن کر دیتا ہے۔

ہم نے اکثر یہ کہتے سُنا ہے کہ یہ بات حقیقت نہیں محض شاعری یا افسانہ ہے۔

ہے کہنے والا جب یہ بات کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ شاعری و افسانہ دراصل جھوٹ ہوتے ہیں لیکن انہیں اگر تجربے کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس "بظاہر" جھوٹ میں انسانی تجربے کی وہ سچائی چھپی ہوئی ہوتی ہے جو ہمیں نیا شعور عطا کرتی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ادب ایسا جھوٹ ہے جو ہمیں سچائی کا نیا شعور عطا کرتا ہے اور اور اسی لیے جب تک انسان اور انسانی معاشرہ زندہ و باقی ہے ہمیں، ہوا کی طرح، ادب کی ضرورت بھی ہمیشہ باقی رہے گی۔ ادب آزادی کی روح کا اظہار ہے۔ ادب سچائی کی تلاش کا موثر ذریعہ ہے۔ لفظ چونکہ ہر دوسرے میڈیم سے زیادہ طاقتور چیز ہے اسی لیے ادب دوسرے فنونِ لطیفہ سے زیادہ، موثر چیز ہے۔

آج کی جدید زندگی میں سائنس پر غیر معمولی زور ہے۔ سائنس نے اشیاء کو تو ہمارے شعور میں داخل کر دیا ہے لیکن فکر و احساس کو زندگی سے نکال باہر کیا ہے اور اسی وجہ سے اس وقت ساری دنیا ایک ہولناک عدم توازن کا شکار ہے۔ زندگی ساری ترقیوں اور حیرت ناک ایجادات و انکشافات کے باوجود، معنویت و توازن سے عاری ہو گئی ہے۔ اسی لیے ساری دنیا اس وقت ایک ایسے نظامِ خیال اور تصورِ حقیقت کی تلاش میں ہے جس سے انسان اپنے وجود کو بامعنی بنا سکے۔ یہ کام ادب کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ ادب ایک طرف ہمیں مسرت بہم پہنچاتا ہے، احساسِ جمال سے لطف اندوز کرتا ہے، دوسروں کے تجربات سے ہمارا تزکیہ (کیتھارسس) کرتا ہے اور دوسری طرف لفظوں کی جمالیاتی ترتیب سے احساس، جذبے یا خیال کو غیر ضروری عناصر سے پاک کر کے اس طور پر سامنے لاتا ہے کہ ہم بھی اُسے پڑھتے ہوئے غیر معمولی بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ ادب جن دنیاؤں میں ہمیں لے جاتا ہے وہ حقیقی دنیا سے زیادہ حقیقی ہوتی ہیں۔ پروست نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہماری اصل زندگی ہماری نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ ادب کا کام یہ ہے کہ وہ اُسے ہمارے سامنے لے آئے اور اس طرح ہمیں خود، ہم سے واقف کرا دے۔ غالب، سرسید،

حالؔی اور اقبالؔ نے اپنی تحریروں سے ہمیں خود، ہم سے واقف کرا کر اس طور پر بدلا ہے کہ ہم نے گویا نیا جنم لیا ہے۔ ادب یہی کام کرتا ہے اور یہی اس کا منصب ہے۔

اس ساری بحث کو سامنے رکھ کر جب ہم خود سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ آخر ہمیں یہ سوال کہ ادب کیا ہے، پوچھنے کی کیوں ضرورت پیش آئی تو ہمارے باطن میں چھپے ہوئے اُس چور سے آمنا سامنا ہوتا ہے جو ہمیں، سائنس کے زیرِ اثر، ادب میں خالص افادیت' کی تلاش پر اکسا رہا ہے۔ یہ سوال ہم اس لیے کرتے ہیں کہ ہماری چھپی ہوئی خواہش اب یہ ہے کہ ادب بھی آج وہی کام کرے جو ائیرکنڈیشنر کرتا ہے، جو پانی کو ٹھنڈا کر کے ریفریجریٹر کرتا ہے یا جو ہمارے بھیگے کپڑوں کی شکنیں، سلوٹیں دور کر کے استری کرتی ہے اور چونکہ ادب ہماری اس خواہش کو پورا نہیں کرتا اس لیے کہ یہ اس کا منصب نہیں ہے تو ہم زندگی میں ادب کی بنیادی اہمیت سے منکر ہو جاتے ہیں۔ ادب کا کام دراصل وہ ہے ہی نہیں جس کی آپ اس سے توقع کر رہے ہیں۔ ادب کا کام تو زندگی میں معنی تلاش کرنا ہے اور ان کا رشتہ ماضی سے قائم کر کے مستقبل سے جوڑ دینا ہے۔ ادب کا حوالہ تو خود زندگی ہے اور وہ اُسے ہی آگے بڑھاتا ہے۔ ادب تو انسانی تجربے کے مکمل علم و آگاہی کا نام ہے اور یہ علم و آگاہی وہ غیر معمولی مرتب و منظم صلاحیت ہے جس کے اظہار کی صلاحیت صرف باشعور و دردمند انسان کے پاس ہے۔ وہ انسان جو نہ صرف اس کے اظہار پر قدرت رکھتا ہے بلکہ جس کا اظہار سچا بھی ہے اور حسین بھی، مکمل بھی ہے اور موثر و مثبت بھی۔ اسی لیے ادب تنقیدِ حیات ہے اور زندگی کے گہرے پانیوں میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کا نام ہے۔

(۱۹۷۹ء)

ادب کا منصب

اگر ادب کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے مزاج اور اس کی روح کا اظہار کرے تو اس اعتبار سے ہم نے ادب تخلیق کرنے سے زیادہ پرچہ نویسی کی ہے یا پھر زیادہ سے زیادہ اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے آپ کو دہرایا ہے یا پھر تخلیقی تجربات کو چھوڑ کر جھوٹے جذبات اور مصنوعی تجربات پر اپنے نام نہاد ادب کی بنیاد رکھی ہے اور جب ایسے میں بات نہیں بنتی اور ہمیں اپنے اندر کے انسان سے وہ اطمینان اور آسودگی میسّر نہیں آتی تو ہم ادب کو کوسنے کاٹنے لگتے ہیں، معاشرہ کو بُرا بھلا کہنے لگتے ہیں اور اس طعن تشنیع سے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔ ہمارا ادب اور ہمارا فن اپنے دور کی ترجمانی کرنے کے بجائے صرف مایوس ہونے پر اکتفا کر رہا ہے۔ ادب سے مایوسی، معاشرے سے مایوسی اور پھر اپنی ذات سے مایوسی۔ چلیئے اگر تھوڑی دیر کو یہ بھی مان لیا جائے کہ مایوسی بھی ایسی کوئی بُری بات نہیں ہے، پھر بھی ہمارے ادب کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہمارے ادیب کم از کم یہ تو کر ہی سکتے تھے کہ وہ اس انتشار، بحران اور مایوسی کے تجربات ہی کا سچائی کے ساتھ اظہار کر دیتے۔ حالانکہ اب زمانہ تو وہ آ گیا ہے کہ ادیب کو مفکّر کا کام اپنے ذمے لے لینا ہے نا کہ صرف تماشائی بن کر تماشے کے طور پر ان حالات کو دیکھے اور گزر جائے۔ ادب، اور ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ موت کا نہیں زندگی کے اظہار کا نام ہے۔ اگر زندگی کی دیواریں گر رہی ہوں پھر بھی ادیب کا کام صرف مایوس ہو کر ناک بھوؤں چڑھا کر الٹی سیدھی بات کہہ دینے کا نہیں ہے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے،

اور آپ بھی اس سے ضرور اتفاق کریں گے کہ زندگی کو سہارا دینا، اسے بنانا سنوارنا، اسے نیا شعور اور نیا طرزِ احساس دینا اور اسے نئے انداز سے مرتب کرنا ادب کا کام ہے۔ بحران اور انتشار کا تجربہ کرنا، اسے اپنے اندر آتار کر اپنے احساس و شعور کا ایک حصّہ بنا لینا ایک بات ہے لیکن اس سے مغلوب ہو جانا اور پھر جھلا کر کوسنا کاٹنا ایک اور بات ہے اور سچّا ادیب کبھی یہ نہیں کرتا۔ کیا ہماری موجودہ تحریریں ہمارے کھوکھلے پن کو ظاہر نہیں کر رہی ہیں؟ ممکن ہے ایسے میں اس کا جواب یہ دیا جائے کہ صاحب چونکہ سارے معاشرے اور اس کی اقدار میں کھوکھلا پن ہے اس لئے ہماری تحریریں بھی کھوکھلی ہیں لیکن یہاں اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریروں کا کھوکھلا پن الگ چیز ہے اور معاشرے کے کھوکھلے پن کا تجربہ اور اس کا اظہار ایک الگ چیز ہے۔ اگر ہماری تحریروں میں موخر الذکر بات بھی ہوتی تو ہم جھک کر سلام کرتے اور آپ یقین مانئے کہ ہم انہیں کھوکھلا ہرگز نہ کہتے۔ اس بات کو ہم ایک مثال سے واضح کرینگے۔ بسر رئلسٹ تصویریں ہمیں فن کے اعتبار سے اکثر بے معنی اور بے کار نظر آتی ہیں لیکن وہ کچھ بھی ہوں کم از کم انہوں نے ایٹم کی وحشتناک تباہی اور دورانِ جنگ کی قتل و غارت گری کا بھرپور اظہار کر کے اپنے دور کے تجربات کو پیش کر دیا ہے اور آج ہم ان تصویروں کو دیکھ کر اس گھناؤنے پن کو محسوس کر لیتے ہیں جس سے اس زمانہ کا انسان دوچار تھا۔ یہ کام نہ کوئی ریڈیو کر سکا اور نہ اخبار۔ فن کے اظہار کے ذریعے ایک طرف تو اس دور کا مزاج اور اس کی روح محفوظ ہو گئے اور دوسری طرف اس اظہار کے ذریعے ایک نیا شعور اور نیا طرزِ احساس پیدا ہو گیا۔ ذرا غور کیجئے کہ کیا ہمارے ادب نے اس سلسلے میں کوئی اقدام کیا ہے؟ کیا ہمارے ادب کا موجودہ رجحان جس کا ذکر ہم نے اوپر کی سطروں میں کیا ہے، کسی طرح بھی قابلِ قبول یا قابلِ تعریف کہا جا سکتا ہے؟ —— دوزخ بہت بُری چیز ہے لیکن اس کا تجربہ کئے بغیر ہم جنّت بھی تو حاصل نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ بات دوسری ہے کہ فردوسِ بریں میں جگہ عطا فرمائے جانے کے لئے دعائیں ضرور کرائی

جا سکتی ہیں۔

ہمارے ہاں ایک طرف تو وہ ادیب ہیں جنہیں ہم سہولت کے لئے "ہرکاروں" کا نام دے سکتے ہیں جو اس بات سے بے خبر ہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور دنیا کس طرف جا رہی ہے۔ یہ بے مغز مورکھ ادیب اپنی بے خبری میں مگن ہیں اور بس زیادہ سے زیادہ خط بانٹنے کا کام کر رہے ہیں۔ دوسری طرف وہ ادیب ہیں جنہیں ہم سادھو اور رشی منی قسم کے ادیب کہہ سکتے ہیں اور جو اپنی "کاوشوں" میں تارک الدنیا ہونے یا گوشہ نشینی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ بھی زندگی سے اتنے ہی دور ہیں جتنے وہ ادیب جنہیں ہم ہرکاروں کے نام سے موسوم کر چکے ہیں۔ اگر ہمیں اردو ادب میں کسی نئے طرزِ احساس کو پیش کرنا ہے تو ہمیں نہ صرف ان دونوں قسم کے ادیبوں کے خلاف جہاد کی ضرورت ہے بلکہ اس بات سے بھی باخبر رہنے کی ضرورت ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اردو ادب کو ایسے ادیبوں کی ضرورت ہے جو اپنے تجربات سے سچائی کے ساتھ آنکھیں ملانے کی سکت رکھتے ہوں۔ جو اس مشینی دور کی لعنتوں اور برکتوں دونوں سے واقف ہوں اور مشین کو اپنے شعور و احساس میں اتار کر اس کے گھناؤنے پن کو محسوس کرنے اور محسوس کرانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جو معاصر زندگی کے طوفانی دھاروں اور خوشگوار ہلکی پھوار دونوں سے باخبر ہوں —— انہی تجربات کے اظہار سے ہم زندگی کو ایک نئی قوتِ آغاز دے سکتے ہیں۔

آج کے ادیب کو شاید اس بات کا بھی تجربہ ہو کہ پوری زندگی "مجہولیت" کی طرف جا رہی ہے اور اس کا اندازہ صرف اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ آج کا انسان پھر سے شخصیت پرست ہو گیا ہے اور ہم نے ایک شخصیت کے اندر اپنے سارے مسائل، اپنی ساری خواہشات کا حل دیکھنا شروع کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس طرح ایک شخص کو حقیقی شخص بنا کر باقی ساری انسانیت کو غیر حقیقی بنا دیا ہے۔ یہی ایک ایسا شخص ہے جو اپنے اندر کی گہرائیوں اور محرکات کی تعمیل کرا سکتا ہے۔ یہی وہ شخص ہے جو بھیڑ کو جھنجھوڑ سکتا ہے

اور جو قاعدہ قانون سے روگردانی کر سکتا ہے۔ جو آزادی کے ساتھ بول سکتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ ہو رہا ہے کہ غیر حقیقی فریب زدہ بھیڑ نے، جسے عوام کے محترم نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اپنے سارے احساسات و جذبات، اپنی ساری صلاحیتِ غور و فکر اس ایک شخص کے حوالہ کر کے خود دروازے بند کر لئے ہیں اور ان میں قفل ڈال دیا ہے۔ یہ جدید تہذیب کا وہ پہلو ہے جسے ہم رجعت پسندی کہہ سکتے ہیں اور رجعت پسندی کسی بھی دور اور کسی بھی زمانہ میں قابلِ تعریف نہیں ہو سکتی۔ ادیب سے اس بات کی اُمید تھی کہ وہ مشینی دور کے اس پہلو کو بھی محسوس کرے گا اور خوف زدہ مجہول انسان کے مسائل پر غور کرے گا اور انسان کو پھر سے اس مرکز میں لا کھڑا کرے گا جہاں اب مشین کھڑی ہے — انسان ہمارا ہیرو ہے۔ ہم نے انسان ہی کو اپنی تہذیب سے خارج کر دیا ہے۔ اسے دوبارہ مرکزی حیثیت دینا ادب کا سب سے بڑا موضوع ہے لیکن اس موضوع کی اہمیت کو ہم اس وقت تک محسوس نہیں کر سکتے جب تک ہم خود اپنے ذہنی افق کو نئے علوم سے وسیع تر نہ کر لیں۔ ویسے یہ بات کہنے کی نہیں ہے اس لئے کہ آپ سب جانتے ہیں کہ بے خبری تخلیق کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ (۱۹۶۰ء)

ادب اور ٹیکنولوجی

ہر آدمی کی طرح ہر زمانے کا بھی ایک شیطان ہوتا ہے. لوگ اپنے زمانے کی ساری بُرائیاں اس کے سر منڈھ دیتے ہیں اور اپنے ضمیر کو یہ سوچ کر مطمئن کر لیتے ہیں کہ اگر یہ شیطان موجود نہ ہوتا تو ان کی زندگی جنت ہوتی. ہمارے زمانے کا شیطان "ٹیکنولوجی" ہے. اگر ہماری اخلاقی اقدار زوال پذیر ہیں، اگر ہماری معاشرتی و تہذیبی روایات ٹوٹ رہی ہیں. اگر ہمارے طرزِ عمل اور رویّے بدل رہے ہیں تو ہم ان سب چیزوں کی ذمہ داری ٹیکنولوجی کے سر تھوپ دیتے ہیں. یہی صورتِ حال ادب کے ساتھ ہے. آپ کسی ادیب سے بات کیجئے تو وہ ادب کے زوال اور انحطاط کا ذمہ دار ٹیکنولوجی کو ٹھہرائے گا. کیا یہ "شیطان" واقعی اس توڑ پھوڑ اور زوال و انحطاط کا ذمہ دار ہے؟ سوال یہ ہے کہ خود ادب کا ٹیکنولوجی سے کیا تعلق ہے؟ ٹیکنولوجی کی ترقی سے ادب کیوں ختم ہو رہا ہے. انسان کو ادب کی زیادہ ضرورت ہے یا ٹیکنولوجی کی؟ معاشرہ ادب کے بغیر بھی ترقی کر سکتا ہے بلکہ کر رہا ہے اور تسخیرِ کائنات میں مصروف ہے. کہیں ایسا تو نہیں کہ اب معاشرے کو سرے سے ادب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے. اسی لئے آج کا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ادب کی ماہیت، نوعیت، ضرورت، اہمیت اور زندگی سے اس کے تعلق پر از سرِ نو غور کیا جائے. بندر کی بلا طویلے کے سر، ہم اپنے فرضی شیطان کو کب تک مطعون کر کے حقیقت سے آنکھیں چراتے رہیں گے.

ذرا غور کیجئے تو ٹیکنولوجی کا ادب سے براہِ راست کوئی تصادم نہیں ہے کیوں کہ دونوں کی ماہیت، تقاضے اور محرکات مختلف ہیں. ادب کا تعلق انسانی ذہن سے ہے جب کہ ٹیکنولوجی انسانی اعضا کی توسیع ہے مثلاً ٹیلی فون اور ریڈیو ہمارے کانوں کی توسیع ہیں. دوربین، خوردبین اور ٹیلی وژن ہماری آنکھوں کی توسیع ہیں. کاریں، ریل گاڑی، پانی کے جہاز اور ہوائی جہاز ہمارے پیروں کی توسیع ہیں. ٹیکنولوجی کی حیثیت و حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اس نے انسانی اعضاء کی محدود قوتوں کو بڑھا کر اس کی کارکردگی میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے. اس کے برعکس ادب کا انسانی جذبات، محسوسات، تخیل اور احساسِ جمال سے تعلق ہے اور جسمانی ضروریات کے بجائے انسان کے اندر کی، باطن کی، اس کی روح کی ضروریات کو پورا کرتا ہے. اس صورت میں ادب اور ٹیکنولوجی کا تصادم ایک افسانے سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا.

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ادب زوال پذیر ہے. کس مپرسی کا شکار ہے، چاہیں تو کہہ لیجئے کہ مر رہا ہے. صرف ہمارے ہاں نہیں بلکہ ساری دنیا میں. لیکن اس کی موت کی ذمہ دار ٹیکنولوجی تو نہیں ہے. وہ تو ادب کو نہیں مار رہی ہے بلکہ سچ پوچھئے تو ادب کو فروغ دینے میں ہاتھ بٹا رہی ہیں. یہ ٹیکنولوجی ہے جس کی وجہ سے دنیا میں ہر سال کروڑوں کتابیں اور رسائل شائع ہوتے ہیں اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں ایسے پہنچتے ہیں کہ جیسے ہمارے اپنے شہر میں چھپ کر شائع ہوئے ہوں. دنیا کے دور دراز گوشوں کی خبریں پل بھر میں ساری دنیا میں پہنچ جاتی ہیں. ہم پاکستان جیسے پس ماندہ ملک میں بیٹھ کر دُنیا بھر کے فکر و فلسفہ کی بات کرتے ہیں. نئی تصانیف اور شعر و ادب میں کئے جانے والے نئے تجربات پر بحث کرتے ہیں. دنیا میں ادب کی اشاعت اتنی زیادہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی ہمارے زمانے میں ہو رہی ہے. ادب کے پڑھنے والے بھی ہمارے زمانے سے زیادہ کسی زمانے میں نہیں ہوئے لیکن ان سب باتوں کے باوجود اگر ادب زوال پذیر ہے اور

اور انحطاط کا شکار ہے تو ہمیں اس کے حقیقی اسباب دریافت کرنے چاہئیں. بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "ٹیکنولوجی" "ادب" سے کچھ نہیں کہتی. کہیں ایسا تو نہیں کہ "سوڈو مفکروں" نے ٹیکنولوجی اور ادب و فکر کے حدود آپس میں ملا کر گزشتہ سو سال کے اندر ہماری فکر ہی میں فساد پیدا کر دیا ہو. سائنس، جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے، مادے اور مادے کے خواص کا علم ہے. نہ وہ اس سے زیادہ کا دعویٰ کرتا ہے اور نہ اس سے آگے جاتا ہے لیکن سُوڈو مفکروں نے اپنے مخصوص مقاصد کو سامنے رکھ کر جو فکر پیش کی اس نے ایسی گڑبڑ پیدا کی اور ایسے نتائج اخذ کئے جو سائنس دان کے نتائج ہرگز نہیں تھے. اس لئے بغیر سوچے سمجھے سارا الزام ٹیکنولوجی کے سر تھوپ دینا کسی طرح بھی صحت مند رویہ نہیں ہے. ادیب، مفکر، دانش ور کی حیثیت سے اس وقت ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مسئلہ پر غور کریں، اس کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ ہمارے دور میں حقیقی فساد کہاں ہے اور یہ کن وجوہ کی بناء پر پیدا ہوا ہے. اسی راستے سے ہم اصل حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں. ادب کو سائنس کی سوکن بنا کر، وجہ بے وجہ ٹیکنولوجی کو کوسنے کاٹنے سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہو سکتا. سوکن والے رویہ سے نہ کبھی مسئلہ حل ہوا ہے اور نہ اب حل ہو سکتا ہے. آئیے ہم سب مل کر اس مسئلہ پر غور کریں.

(۱۹۷۷ء)

ہنگامی ادب

ہم جس دور میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے وہ حسنِ اتفاق سے تاریخ کا ایسا دور ہے جس میں ہر طرف بحران ہی بحران ہے۔ جنگ مسلسل ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ پرانے خیالات اور اقدار ابھی سسک رہے ہیں۔ نئے پیدا نہیں ہوئے ہیں یا اتنے ننھے منّے ہیں کہ ان کی اہمیت متعیّن نہیں کی جا سکتی۔ دنیا اس تیزی سے بار بار پلٹا کھا رہی ہے کہ فکر کی راہیں دھندلا گئی ہیں۔ نہ کچھ سجھائی دیتا ہے نہ دکھائی دیتا ہے۔ اس اندھیرے میں نہ ساری باتیں سمجھ میں آتی ہیں نہ سُنی جاتی ہیں۔ پھر اس پر ہم اس کا رونا بھی روتے ہیں کہ ادب کی اہمیت معاشرے میں مسلّم نہیں رہی ہے۔ اگر ذرا دیر کو اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے ادیب کی حیثیت سے کیا کیا ہے۔ ہم نے اس بات کو کہاں تک سمجھا ہے کہ سماج میں کیا ہو رہا ہے۔ سماج کس طرف جا رہا ہے اور سماج میں پیدا ہونے والے نئے نئے واقعات کا ہماری زندگی پر، اجتماعی و انفرادی حیثیت سے کیا اثر پڑ رہا ہے۔ ہم معاشرہ کو کچھ دیں گے تو معاشرہ اس کے عوض میں ہمیں بھی کچھ نہ کچھ ضرور دے گا ——— شہرت بھی اور جاہ و مال بھی! اب تو کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ ادب کا رشتہ عام زندگی سے منقطع سا ہو کر رہ گیا ہے۔ ادیب اپنے خول میں بیٹھ گئے ہیں اور ایک مینار سا اپنے ارد گرد کھڑا کر لیا ہے جہاں دھوپ اور روشنی بھی ٹھیک طور پر نہیں پہنچ پاتی۔ پورا معاشرہ زخموں سے سڑ رہا ہے ہم اُس کے بارے میں نہ کچھ سوچتے ہیں اور نہ اسے قابلِ التفات سمجھتے ہیں۔ انہی موضوعات پر

قلم اُٹھائے ہیں جن پر ہمارے اسلاف لکھتے چلے آئے تھے۔ بس ذرا اسلوب اور کہنے کے انداز کو بنا سنوار لیتے ہیں اور پھر اللہ اللہ اور خیر سلا۔ ہم میں نہ اب زندگی کی حرارت اور نئی منزلوں کو سر کرنے کا حوصلہ رہا ہے۔ عوام میں جو کچھ توانائی پیدا ہوتی ہے اسے ہم اپنی دل آزاری سے ضائع کر دیتے ہیں اِن سب باتوں کے پیشِ نظر اگر دیکھا جائے تو اس وقت ہمارے ادب اور معاشرہ کو ہنگامی ادب TOPICAL LITERATURE کی ضرورت ہے جس میں اپنے مسائل کو سلجھایا جائے، اچھے انداز میں اور نئے پن کے ساتھ۔ تاکہ عام پڑھنے والا بھی ان خیالات کو، جو آپ سماج میں مروج کر کے اسے ایک راستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں، پڑھ کر آپ کی رائے سے اتفاق کر کے اسی طرح سوچنے لگے جس طرح آپ نے سوچا ہے۔ اب محراب و منبر سے نیچے اُتر کر معاشرہ اور عوام میں گھل مل کر ان کو دیکھنا ہے ورنہ معاشرہ میں ادب ڈھونگ ہی ڈھونگ رہے گا اوڑھنا بچھونا نہیں بن سکتا۔ محض لکھنے کی خاطر لکھنا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر فخر کیا جائے۔

ادیب معاشرے کا سب سے ذمہ دار شخص ہوتا ہے۔ کوئی محسوس کرے یا نہ کرے لیکن ادیب ہر لمحہ کو، ہر واقعہ کو صحیح پس منظر میں سب سے پہلے سمجھ لینے کی صلاحیت اور قوت رکھتا ہے اور پھر اُسے دوسروں تک پہنچانا اور روشنی دکھانا اس کا فرض ہو جاتا ہے۔ ژاں پال سارتر نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر ادیب لکھتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے یہ فرض سنبھال لیا ہے کہ اس دُنیا میں جہاں آزادی کو ہر دم کھٹکا لگا رہتا ہے۔ آزادی کے نام کو آزادی سے مخاطب ہونے کی سرگرمی کو جاوداں بنا دیا جائے۔ جو ادیب یہ پہلو اختیار نہیں کرتا وہ مجرم ہے۔ اور مجرم ہی نہیں وہ پھر ادیب بھی باقی نہیں رہتا۔ ہم بیک وقت شہری بھی ہیں اور ادیب بھی ہمارے اردگرد ہونے والے واقعات، سیاسی و سماجی رجحانات، قومی اور بین الاقوامی مسائل کو اپنے طریقہ پر سلجھانا بھی تو ہمارا ہی کام ہے۔ آخر صرف اخبار نویس تو اس بات کو حسنِ خوبی

کے ساتھ انجام نہیں دے سکتے۔ ہمارے ناولوں، افسانوں اور ڈراموں کے ہیرو اور کردار یہ کام انجام دے سکتے ہیں —— کسی واقعہ سے پہلے ہم ایک شہری کی حیثیت سے متاثر ہوتے ہیں، ادیب کی حیثیت سے متاثر ہونے کے بعد ہم غور کرتے ہیں، اس سے نتائج اخذ کرتے ہیں، اور پھر اپنے اپنے طریقے پر ان حقائق کی تشریح کرتے ہیں، اور پھر جب یہ واقعات ایسے ہوں کہ ان سے آزادی میں خلل آرہا ہو، جماعتی استحصال زور پکڑ رہا ہو، معاشرہ زوال کی طرف جا رہا ہو اور پھر یہ باتیں ہمارے شعور کا ایک جزو بھی بن چکی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ "شہری" میں "ادیب" کیسے نہیں جاگتا! لالٹین کتنی ہی خوب صورت اور خوشنما کیوں نہ ہو اس سے روشنی بھی تو ضرور نکلنی چاہیئے۔ اور یہ روشنی صرف TOPICAL LITERATURE ہی کے ذریعہ پیدا ہو سکتی ہے۔ ناول، کہانی، اور ڈرامہ میں اسے اپنانے کی پوری پوری صلاحیتیں موجود ہیں۔

(۱۹۵۶ء)

ادب اور قاری کا رشتہ

یہ دوسری جنگ عظیم کی بات ہے کہ نازیوں نے فرانس پر قبضہ کرلیا اور بہت سے فرانسیسی دانشوروں اور ادیبوں کو گرفتار کرلیا۔ یہ وہ دانشور اور ادیب تھے جو نازیوں کے قبضے کے خلاف مزاحمت کی تحریک چلا رہے تھے۔ نازیوں نے طے کیا کہ ان گرفتار شدہ دانشوروں کے لیے خاص قسم کے پروگرام نشر کیے جائیں تاکہ وہ ذہنی کرب اور مایوسی کا شکار ہو کر مزاحمت سے دست بردار ہو جائیں۔ ایسے پروگرام جن سے اُن کے خیالات کی بے معنویت کا مذاق بھی اُڑایا جا سکے۔ یہ خاص پروگرام اِن قیدیوں کے لیے نشر کیے جاتے اور انھیں سُنائے جاتے۔ صورت یہ تھی کہ وہ پروگرام سُن تو سکتے تھے لیکن کہہ کچھ نہیں سکتے تھے۔ وہ صاحب جو یہ پروگرام لکھتے اور نشر کرتے تھے، وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ سننے والے کیا سوچ رہے ہیں اور ان کا کیا ردِّ عمل ہے اور اس کی تحریروں اور نشریات کا اُن پر کیا اثر ہو رہا ہے۔ صورت حال یہ تھی کہ لکھنے والے اور سننے والے کے درمیان کوئی رشتہ قائم نہیں ہو سکا تھا۔ لکھنے والے کو یہ تو معلوم تھا کہ وہ کس کے لیے لکھ رہا ہے اور کیوں لکھ رہا ہے لیکن وہ سننے والوں کی رائے، تاثرات اور ردِ عمل سے بے خبر تھا۔ اس بات کا اثر یہ ہوا کہ کچھ عرصے تک تو وہ یہ پروگرام لکھتا رہا لیکن جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ اس کا قلم سوکھ رہا ہے اور لکھنے کی عمر کم ہوتی جا رہی ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں لکھنے کی کوشش کے باوجود وہ نہ لکھ سکا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ آخر وہ لکھنے سے کیوں قاصر ہے تو اس نے جواب دیا کہ سامعین سے رشتہ قائم نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ذہن بے معنویت کا شکار ہو گیا ہے اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے کا عمل بے کار ہے۔

یہ واقعہ جو میں نے ابھی پیش کیا اس سے یہ بات یقیناً واضح ہو جاتی ہے کہ لکھنے کا عمل بذات خود دو طرفہ عمل ہے۔ لکھنے والے کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کیوں لکھ رہا ہے؟ یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کس کے لیے لکھ رہا ہے؟ اس کے قاری کون ہیں اور وہ اس کی تحریروں کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور کس ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ ادب اور قاری کے درمیان یہ رشتہ اگر قائم ہو جائے تو لکھنے والا اعتماد اور قوت کے ساتھ لکھتا رہتا ہے! اس کا قلم تازہ دم رہتا ہے اور قاری کے ردِ عمل سے پیدا ہونے والا تخیل، فکر اور احساس اس کی تحریر کو ایک نئی وسعت اور گہرائی عطا کرتے رہتے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ سرشار نے برسوں تک قسط وار فسانۂ آزاد لکھا جس کی چار بہت ضخیم جلدیں شائع ہوئیں، تو اس سارے تخلیقی عمل میں پڑھنے والے برابر کے شریک تھے۔ اُس ردِ عمل سے جو قاری اپنے خطوط یا گفتگو سے بہم پہنچاتے تھے، سرشار کی تخلیقی قوت ثابت و سالم رہی اور اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود فسانۂ آزاد اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ اگر فسانۂ آزاد کے مشہور کردار آزاد اور خوجی کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے ارتقاء کو بغور دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اِن کرداروں کی تخلیق میں فسانۂ آزاد کے بے شمار پڑھنے والوں کی خواہشات اور ان کے تخیل کی پرواز شامل تھی۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی ادب کے بڑے دور وجود میں آئے تو سماجی قوتوں اور تہذیبی عوامل کے ساتھ ساتھ ادب پڑھنے اور اس میں گہری دلچسپی لینے والے قارئین ہمیشہ شریک رہے ہیں۔ اگر لکھنے والے کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کی تحریر پڑھنے والے موجود نہیں ہیں تو لکھنے کا عمل کمزور پڑ کر بند ہو جائے گا۔ غالب اپنے دور میں مشکل گو شاعر تھے اور ان کا کلام استاد ذوق کے مقابلے میں مقبول نہیں تھا لیکن اس کے باوجود ان کے اپنے دور میں ان کی شاعری کو سننے، پڑھنے اور پسند کرنے والوں کا ایک حلقہ ضرور موجود تھا جس سے حضرت غالب کا گہرا اور براہِ راست رشتہ قائم تھا۔ اس رشتے کے بغیر جیسا کہ آپ نے اب محسوس کیا ہوگا، ادب کی تخلیق

کمزور پڑ جاتی ہے۔

ہمارے دور میں جو اس وقت تخلیقی ادب پر پوری بہار نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ادیب اور قاری کے درمیان وہ گہرا اور براہ راست رشتہ اس طرح قائم نہیں ہے جس طرح قائم ہونا چاہیئے۔ اس کی وجہ جہاں یہ ہے کہ ہم ذہنی و فکری سطح پر عبوری دور سے گزرتے ہوئے اپنی شناخت کے خدوخال دریافت کرنے میں مصروف ہیں وہاں چند وجوہ اور بھی ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ تیز رفتار زندگی میں، جس کے ہم ابھی پورے طور پر عادی نہیں ہوئے ہیں اور کچھ بوکھلائے ہوئے سے ہیں، اخبار نے کتاب کی جگہ لے لی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں ادب کی جو تعلیم اسکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک دی جاتی ہے وہ فرسودہ اور بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس تعلیم سے طلبا میں ادب کا وہ ذوق اور ادب کا وہ شعور پیدا نہیں ہوتا جو اب تک ادب کی تعلیم پیدا کرتی رہی تھی۔ قدیم ادب پڑھایا جائے یا جدید ادب، اُس کا رشتہ ہمارے اپنے دور سے ہونا ضروری ہے، ورنہ طالب علم کے لیے کلاسیکی ادب ایک مُردہ چیز بن کر رہ جائے گا۔ مُلّا وجہی کی "سب رس" قدیم ادب کا ایک شاہکار ہے۔ اگر اسے جدید دور کی معنویت کے تعلق سے نہیں دیکھا اور پڑھایا جائے گا تو طالب علم کے لیے اس سے لطف اندوز ہونا مشکل ہو جائے گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ادب خواہ قدیم ہو یا جدید، زندگی سے ہماری دلچسپیوں کو گہرا کرتا ہے۔

تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ لکھنے اور پڑھنے والے کا رشتہ کمزور پڑ گیا ہے۔ اس رشتے کی کمزوری میں لکھنے والے کی فکر اور ذہن کی بے سمتی کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ یہ ضروری ہے کہ لکھنے والے کو ہمیشہ یہ معلوم رہنا چاہیئے کہ وہ کیوں لکھ رہا ہے اور کس کے لیے لکھ رہا ہے؟ پریسچیت نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی تحریر کوئی نہیں پڑھے گا

تو وہ اپنی فطری اُپج کے باعث شاید لکھنا تو بند نہ کرے لیکن وہ بجائے قلم سے کاغذ پر لکھنے کے، صرف اپنے ذہن میں لکھے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اس عمل میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔

جب یہ صورت پیدا ہوتی ہے تو تخلیقی توانائی کمزور پڑ جاتی ہے اور تحریر میں اثر آفرینی کی وہ قوت پیدا نہیں ہو پاتی جس سے پڑھنے والے کا ذہن لکھنے والے کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ اچھا اور بڑا لکھنے والا پڑھنے والوں کی ایک جماعت خود پیدا کرتا ہے۔ انھیں متاثر کرتا ہے اور ان کے ذہن کو بدلتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ پڑھنے والوں کے ردِ عمل سے وہ خود بھی متاثر ہو کر بدلتا رہتا ہے۔

ممکن ہے کہ آپ میں سے کچھ لوگ یہ کہیں کہ آخر زندگی میں ادب کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سوال بذاتِ خود ادب کے مزاج اور اس کی نوعیت سے بے خبری کا ثبوت ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ آخر میر، غالب اور اقبال یا مولانا روم، سعدی و حافظ آج بھی ہمیں کیوں متاثر کرتے ہیں، حالانکہ زندگی کے انداز اور فکر و نظر کے سانچے بالکل بدل گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب ابدی سچائیوں کو، زندگی کے چھوٹے بڑے تجربوں کو ایسے رس اور پیرائے سے بیان کرتا ہے کہ یہ سچائیاں خوب صورت لفظوں میں ہمیشہ کے لیے دل میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ ادبی اظہار سچائیوں اور تجربات کا جامع اور تہ دار اظہار ہوتا ہے جس کے مختلف پہلو زندگی کے بدلنے کے ساتھ ساتھ از خود واضح ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ کتنی بڑی دین ہے کہ ادب کے ذریعے ہم دوسروں کے تجربوں اور سچائیوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔

غور کیجیے اگر ادب وہ کام نہ کرتا جو وہ اب تک کرتا آیا ہے اور اگر مولانا روم، سعدی، حافظ یا شکسپیئر، گوئٹے، ٹالسٹائی، میر، غالب اور اقبال وغیرہ نہ ہوتے اور ان کے تجربے انسان کی فکر اور احساس کا حصہ نہ بنتے تو انسان آج بھی ایک ننھے بھولے بچے کی طرح ہوتا۔ ادب کے ذریعے ہی انسان بلوغت کے درجے پر پہنچا ہے۔

یہ میرا اور آپ کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ زندگی بسر کرتے ہوئے ہم بہت سے

جذبوں سے گزرتے ہیں۔ بہت سے نامعلوم احساس سے ہمیں واسطہ پڑتا ہے۔ بہت سے ادھ کچرے تجربات سے ہم گزرتے ہیں لیکن ہم انھیں بیان نہیں کر سکتے۔ محسوس تو کرتے ہیں لیکن پوری طرح نہیں۔ یہ سب جذبے، یہ سب احساس، یہ سب تجربے ہمارے لیے بے نام ہوتے ہیں اور یوں ہی گزر جاتے ہیں لیکن جب ان تجربوں اور جذبوں سے ہمارا واسطہ کسی ناول، کسی افسانے، کسی مضمون، کسی شعر، کسی ڈرامے سے پڑتا ہے تو ہمارا نامعلوم احساس معلوم ہو جاتا ہے اور ہم اس کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں اور دوسروں کے تجربے اس طرح ہمارے شعور کا حصہ بن جاتے ہیں اور اس طرح ہم اپنی زندگی میں نئے معنی، فکر کی نئی وسعتیں اور احساس کی نئی گہرائیاں تلاش کر لیتے ہیں۔ ادب اپنے پڑھنے والے کو یہی دیتا ہے اور جب تک انسان، انسان ہے یہی دیتا رہے گا۔

میں اپنی بات کو ایک مثال سے واضح کروں گا۔ اپنی محبوبہ کو رقابت یا حسد کی شدت کے زیر اثر قتل کرنے کا تجربہ حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ لیکن شیکسپیئر کے اوتھیلو کو پڑھ کر یا اسٹیج پر دیکھ کر یہ تجربہ ہمارا اپنا تجربہ بن جاتا ہے۔ فاؤسٹ کو پڑھ کر گوئٹے کے تجربے یا اینا کرینا کو پڑھ کر ٹالسٹائی کے تجربے میرے اور آپ کے تجربے بن جاتے ہیں۔ امراؤ جان ادا، ابن الوقت، مرزا ظاہر دار بیگ کے کردار اس طرح ہمارے شعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔

یہاں میں آپ کو ایک سوال اٹھانے کی اجازت دیتا ہوں۔ آخر ان تجربات کا شعور یا ادراک حاصل کئے بغیر بھی تو ہم زندگی گزار سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں آپ کو ایسی زندگی گزارنے سے باز تو نہیں رکھ سکتا لیکن صرف اتنا کہوں گا کہ یہ زندگی وہ زندگی نہیں ہے جو ایک باشعور انسان بسر کرتا ہے یا اسے بسر کرنی چاہیئے۔ یہ بات یاد رہے کہ اگر ہم اپنی زندگی کو ساری زندگی سے کاٹ کر صرف اپنے تجربات تک محدود کر لیں تو ہماری زندگی ایک اندھا کنواں بن کر رہ جائے گی اور عین ممکن ہے کہ ہمارے اپنے تجربات کوئی خطرناک صورت اختیار کر لیں۔ ادب کے ذریعے دوسروں کے تجربات میں شریک ہو کر ایک طرف قاری کا تزکیہ اور

کتھارسس ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اس کی زندگی میں ایک نیا اعتدال، ایک نیا توازن پیدا ہو جاتا ہے جس سے دور دور تک قطار اندر قطار روشنی نظر آنے لگتی ہے۔ یہی وہ روشنیاں ہیں جو شعور کی علامت ہیں اور جس سے گزر کر فرد اور معاشرہ زندگی کے گہرے سمندروں میں ڈوب کر سراغ زندگی پانے لگتے ہیں۔ آئیے ہم سب اس مسئلے پر غور کریں اور ادب، زندگی تہذیب اور قاری کے اس رشتے کو پھر سے دریافت کریں۔

(۱۹۸۴ء)

ادب اور چٹکلے بازی

آج کل بات سنانے کا واحد طریقہ یہ رہ گیا ہے کہ بات کہنے سے پہلے چٹکلے بازی کیجئے دو چار قصّے یا لطیفے سنائیے پڑھنے والوں میں ذرا سی سنسنی پیدا کیجئے اور بات ختم کر دیجئے۔ جہاں آپ نے سنجیدہ بات سنجیدہ طریقہ سے کہی اور پڑھنے والے نے ناک بھوئیں چڑھائیں اور کتاب یا رسالہ بند کیا اور کرکٹ کی کومنٹری یا ریڈیو سیلون سے فلمی گانے سننے لگا پڑھنے والوں کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ ایسی چیزیں ہمیں دیجئے جن سے دماغ پر بوجھ نہ پڑے اور جو صرف تفریحِ طبع کے لئے لکھی گئی ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سنجیدگی کی جان کے لالے پڑ گئے ہیں اور سطحیت اور جذباتی فلرٹیشن کا عفریت ہمارے ذہنوں پر حکمرانی کر رہا ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ بہت سے سنجیدہ لکھنے والوں نے بھی اس مطالبے کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اور تو اور اب تنقیدی مضامین کا رجحان بھی یہی ہو گیا ہے کہ صرف لطیفوں فقروں اور قصوں کی پوٹ معلوم ہوتے ہیں۔ مضمون کے دوران میں کبھی ایک آدھ سنجیدہ بات آگئی تو آگئی ورنہ قصّہ در قصّہ چلتا رہے گا یہاں تک کہ مضمون ختم ہو جائے گا اور کہانی کی روایت کے مطابق ہیسہ ہضم ہو جائے گا۔ ایسے مضامین کو پڑھنے کے بعد آپ ذرا سوچئے —— واضح رہے ہم نے ذرا کا لفظ استعمال کیا ہے —— کہ لکھنے والے نے کیا کہا ہے اور پڑھنے والے تک کیا پہنچا ہے تو نتیجہ کے طور پر دو چار کمزور فقرے، ایک آدھ بے جان لطیفہ یا قصّہ ذہن میں ابھرے گا اور بس۔ نہ ان مضامین سے کسی ذہنی رویّے کا پتہ چلتا ہے نہ کسی خیال

کا۔ زیادہ سے زیادہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے سنجیدگی کو منہ چڑایا ہے۔ یہ بات ہم نے اس لئے لکھی ہے کہ یہ رجحان بذاتِ خود بہت خطرناک ہے اور اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ لکھنے والوں نے بھی اب سنجیدگی کی طرف سے منہ موڑ لیا ہے اور اپنی شکست تسلیم کر لی ہے۔ آج کے بہت سے لکھنے والے ادب کو کرکٹ کے معیار سے دیکھ رہے ہیں اور اردو ادب کے بیشتر پڑھنے والے (جس میں آپ کا نام شامل نہیں ہے) تحریروں کو کومنٹری یا ریڈیو سیلون کے گانے سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ ایسے لکھنے والے یہ چاہتے ہیں کہ ان کی تحریروں کی اونچی دوکان پر شائقین کا وہ ہجوم ہو کہ تولتے تولتے ان کے ہاتھ دکھ جائیں اور ہر شخص امرتی بالوشاہی کی اس قدر تعریف کرے کہ ان کی محنت وصول ہو جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ادھر مضمون لکھا ادھر تعریفوں کے پل بندھ گئے۔ جدھر نکلے ادھر لڑکے لڑکیاں آٹو گراف بک لے کر آگئے۔ قصہ مختصر یہ کہ ادیب کرکٹ اور ریڈیو سیلون کی مقبولیت سے ایسا بوکھلا گیا ہے کہ اس نے اپنی ذات پر سے اعتماد اٹھا دیا ہے۔ اب وہ پڑھنے والوں کو صرف وہ دے رہا ہے جس کے وہ خواہش مند ہیں۔ وہ نئے خیالات سے خوف زدہ ہے۔ وہ سنجیدگی سے سہما ہوا ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے نیوزی لینڈ کی ایک فلم ایکٹریس کا انٹرویو کسی رسالے میں شائع ہوا تھا۔ یہ فلم ایکٹریس جب دنیا کی سیر کرتے کرتے امریکہ پہنچی اور اخبار والوں نے اسے گھیرا تو اس نے کہا کہ امریکہ پہنچ کر مجھے جس چیز کا شدید طور پر احساس ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ سارا امریکہ عورت کے خوف میں مبتلا ہے! امریکہ میں جو تصویریں نظر آتی ہیں ان میں یا تو صرف پنڈلیاں اور رانیں دکھائی گئی ہیں یا پھر صرف سینہ۔ امریکی قوم پوری عورت کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی۔ انٹرویو پڑھتے وقت یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ عورت صبح ناشتہ میں آدھا سیر کچا گوشت کھاتی ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ عورت اگر سیر کرتے کرتے پاکستان کی طرف بھی نکل آتی تو وہ یہاں کے لوگوں کو دیکھ کر یہی کہتی کہ یہاں کے لوگ 'خیال' کے خوف میں مبتلا ہیں۔ وہ پورے 'خیال' کو دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتے اور یہ لوگ تلے ہوئے

گوشت اور زندگی کے حقائق میں فرق نہیں کرتے۔ ہم نے ہر چیز کا کیپسول بنا لیا ہے اور وقت ضرورت اسے سٹک لیتے ہیں۔ فلسفہ و فکر سے ہمیں اس لئے نفرت ہے کہ اس سے نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں جن سے ہم آنکھیں چار نہیں کر سکتے۔ ہماری ساری زندگی کیپسول میں بند ہو کر رہ گئی ہے کہیں کاہلی کا کیپسول ہے۔ کہیں شہرت اور مادی خوشحالی کا۔ کہیں صحافت کا کیپسول ہے کہیں کمیٹیوں کا۔ بہر حال ہر قسم کے کیپسول سارے معاشرے میں عام طور پر سستے داموں مل رہے ہیں۔ ادب بھی رفتہ رفتہ کیپسول میں اُترتا جا رہا ہے اور شاید وہ دن دور نہیں ہیں جب کمیٹیوں کے کیپسول ادبِ عالیہ تخلیق کیا کریں گے اور کمیٹیوں کی لکھی ہوئی چیزیں شہرتِ عام اور بقائے دوام کا خلعت اوڑھا کریں گی بہر حال ہمیں تو اس سلسلے میں صرف یہ کہنا ہے کہ اپنے آپ سے اعتماد اٹھا دینے کا یہی نتیجہ ہو سکتا تھا۔ اب تک ادب ایک ایسا ذریعۂ اظہار تھا جہاں ادیب ایک فرد کی حیثیت سے دوسرے فرد سے بات کر سکتا تھا۔ اب ادیب بھی یہ حیثیت فرد کے باقی نہیں رہا۔ وہ بھی کمیٹیوں اور اداروں میں اُتر رہا ہے اور ذات کے مطالبات کو ترک کر کے کمیٹیوں کے مطالبے پورے کرنے میں مگن ہے۔ وہ بھی اب چیونٹیوں کی فطرت کو عزیز رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسرا راستہ اختیار کرنے میں صرف گھاٹا ہی گھاٹا ہے اور گھاٹے کا سودا کون عقلمند ہے جو کرے گا۔ لیکن اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ہم یہ بات آپ کے کان میں کہہ دیں کہ تہذیب کے کارخانے میں ہمیشہ "بے وقوفوں" کے لئے اہم جگہ ہوتی ہے۔ یہ ویسے کوئی راز کی بات نہیں ہے۔ آپ ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ بحرِ مسجور میں یا تو حضرت جبرئیلؑ نہاتے ہیں یا پھر سچا ادیب۔

یہ تو ہم نے ایک ایسے رجحان کی بات کی جو اس وقت مقبول ہو کر ادیبوں کی صلاحیتوں پر تخریب کا پُچارا پھیر رہا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ اردو زبان و ادب کے سارے سچے ادیب کسی نئے راستے کی تلاش میں نظر آتے ہیں۔ وہ کسی ایسے آسمان کی تلاش میں ہیں جو شدت کے ساتھ زمین سے وابستہ ہو ہمیں سارے حقیقی ادیبوں کے ہاں ایک اضطراب ایک بے چینی کی لہر نظر آتی ہے جس میں کچھ کرنے کی جستجو کا بڑا ہاتھ ہے۔ اکثر ادیب نہایت بے باکی اور دیانتداری

کے ساتھ اپنے خیالات واحساسات کا اظہار کر رہے ہیں جس کی سمجھ میں جو بات آ رہی ہے وہ اس کو بلا تامل پیش کر رہا ہے۔ کچھ باہر سے قلمیں لا کر لگا رہے ہیں، کچھ اپنے پرانے علمی خزانوں کی طرف رجوع ہو رہے ہیں، کچھ نہایت خلوص کے ساتھ اپنی تقدیر کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ تہذیب کے مسائل کو سمجھکر نئے عناصر اور نئے عوامل کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ کچھ پرانے موضوعات کو نیا رنگ دے رہے ہیں۔ کچھ شعر و شاعری، مضامین وغیرہ میں خیال، اظہار اور تکنیک کے نئے تجربے کر رہے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو کائنات کو اپنی ذات میں اتار کر اس کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ سب ادیبوں میں یہ رجحان اُبھرتا محسوس ہوتا ہے کہ اپنی ملی روایت سے رشتہ ناطہ منقطع کرنے کے بجائے اب وہ اس میں روایت کے ایک نئے بامعنی تسلسل کو تلاش کر رہے ہیں، تاکہ وہ ان بنیادوں پر کھڑے ہو کر اونچے ہو سکیں۔ تقلید مغربی نے ہم میں سے قوتِ انتخاب و فیصلہ کی جو صلاحیت چھین لی تھی اب ادیب اسے ترک کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں اور اس کا سبب شاید یہ ہے کہ صرف مادی ترقی سے مغرب نے جو کچھ حاصل کیا وہ ذہنی بے سکونی، اور روحانی انتشار کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور اب ہمیں اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ اگر ہم بھی اپنی روایات سے الگ ہو کر صرف اسی راستے پر چلے تو ہمارا بھی یہی حشر ہو گا۔

بہر حال اس وقت ہمیں ادیب کی حیثیت سے اتنا ضرور کرنا چاہئیے کہ ہم جو کچھ سوچیں سنجیدگی سے سوچیں اور جو کچھ کہیں ایمان داری اور سنجیدگی سے کہیں۔ وہ لوگ جو مصلحت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں یا جو مصلحتوں کے پیشِ نظر ادب کو استعمال کرنا چاہتے ہیں اور ادب و فن کو مصلحتوں کا غلام بنانا چاہتے ہیں وہ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ ایسا کرنے سے ہم ساری قوم کے شعور سے اس آگاہی، ادراک اور حسیت کو مٹا رہے ہیں جس کے سہارے قومیں آگے بڑھتی ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری نسل کے لوگ اب ذہنی طور سے زیادہ بیدار ہو گئے ہیں جو نہ صرف اپنا فرض پہچان رہے ہیں بلکہ اسی تلاش و جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی رویہ میں ہماری، ہماری قوم اور ہمارے زبان و ادب کی سلامتی ہے۔

؎ زندہ آن است کہ با دوست وصالے دارد

(۱۹۶۱ء)

ادب، سائنس اور نئی نسل

کچھ دن سے یہ سوال بار بار ہمارے سامنے آرہا ہے کہ اس دور میں جب سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ قدم قدم پر ہمارا ساتھ دے رہی ہے، ہمارے مُسَلّمہ نظریات ایک ایک کرکے ٹوٹ رہے ہیں، زمان و مکان کے تصورات میں تبدیلیاں ہورہی ہیں، تو ایسے میں ادب کا کیا رول ہوگا؟ کیا مستقبل میں ادب کی اہمیت ختم ہوکر رہ جائے گی۔ کیا سائنس ادب کی جگہ لے کر اسے معاشرے کی زندگی اور مزاج سے نکال باہر کرے گی۔ کیا ادب اس تیزی کے ساتھ بڑھتی اور پھیلتی ہوئی زندگی کا ساتھ دے سکے گا جسے سائنس کہیں سے کہیں پہنچا رہی ہے؟ اور اب جب کہ سائنس نے نئے نئے مسائل کھڑے کردیے ہیں۔ حالات، سیاسیات، واقعات تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں جن کی مثال ماضی میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون نے قربت کا احساس اور زیادہ کردیا ہے۔ دنیا کے دور دراز کے گوشوں میں ہونے والا واقعہ ساری دنیا کے نظام اور زاویۂ فکر کو متاثر کرسکتا ہے۔ انگلستان میں ہونے والا معاشی بحران ساری دنیا میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ماسکو ریڈیو کی ایک خبر سارے ملکوں کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوسکتی ہے تو ایسے میں ادب کی حیثیت و اہمیت کیا رہ جاتی ہے؟ اس سلسلہ میں کچھ لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ ادب مستقبل قریب میں بلّی کا گُو بن کر رہ جائے گا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہار مان لی جائے۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ فی الحال مناسب یہی ہے

کہ چپ سادھ لی جائے اور جب یہ طوفان ذرا ہلکا پڑ جائے، چڑھی آندھی اُتر جائے اُس وقت اِس موضوع پر غور کیا جائے۔ ان دونوں باتوں میں دراصل وہی احساسِ کمتری کام کر رہا ہے جو سائنس کے تعلق سے ادب والوں کے دل و دماغ پر مسلط ہو گیا ہے۔ اب ایسے میں اگر یہ دیکھ لیا جائے کہ سائنس کا حلقۂ اثر کیا ہے، ادب کا راستہ کون سا ہے اور وہ کون سی باتیں ہیں جو اس سلسلے میں ادب سے وابستہ ہو گئی ہیں اور جنہیں ہم ادب میں نہ پاکر مایوس ہونے لگتے ہیں تو ساری الجھنیں دور ہو جائیں اور مسئلے کی اصلیت ہمارے سامنے آ جائے۔

سائنس کے فیض سے دو باتیں خاص طور پر رواج میں آئیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ کائنات میں کوئی حقیقت دائمی نہیں ہے، ہر صداقت عارضی ہے۔ اس بات کا اثر یہ ہوا کہ ہم اپنی فکر کی مجبوریوں سے آگاہ ہو گئے اور عام زندگی میں اس کا اثر یہ پڑا کہ بے یقینی اور مشترک عقیدہ کا فقدان، ہمارا ایمان بن گیا۔ دوسری بات 'مادیت پرستی' کے رجحان کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس کا اثر یہ پڑا کہ ادب والے بھی اسی رَو میں بہہ گئے اور ادب میں براہ راست افادیت تلاش کرنے لگے۔ جب افادیت تلاش کرنے کی بات پیدا ہوئی تو ظاہر ہے مقابلے میں سائنس تھی۔ ادب بے چارہ نہ تو کمروں کو گرم کر سکتا تھا نہ ہمیں لندن، نیویارک، ماسکو پہنچا سکتا تھا۔ نہ ہمارے کانوں کو اتنا لمبا کر سکتا تھا کہ ہم طول طویل فاصلو سے باتیں کر سکیں۔ اور جب ہم نے ادب و شعر کو بھی اسی پیمانے سے ناپنا شروع کر دیا اور اس سے بھی وہ لامحدود توقعات وابستہ کرلیں اور ہر اس چیز کو ادب سے چسپاں کر دیا جس میں ذرا سے بھی عظمت کے نشان نظر آئے تو ہم ادب کے مستقبل کے سلسلے میں مایوس ہونے لگے اور ہمیں اپنا احساس کمتری ادب میں بھی نظر آنے لگا۔ یہی وہ بنیادی غلطی تھی جو ہم سے سرزد ہوئی۔ ادب تو انسان کی ان خواہشات کا اظہار ہے جنہیں وہ حاصل کرنا چاہتا ہے مگر حاصل نہیں کر سکا ہے۔ اب ذرا اس معیار پر طلسم ہوشربا، باغ و بہار، انوار سہیلی اور

الف لیلیٰ کو دیکھئے۔ ان خیالی داستانوں اور قصوں میں انسانی تجربات کا مطالعہ ملتا ہے۔ ان قصے کہانیوں میں وہ تعمیم ملتی ہے جس کی بنیاد ہماری خواہشات پر ہے۔ ان داستانوں میں انسانی ذہن نے اپنے تخیل کو وہاں تک اڑنے دیا جہاں تک اس کی رسائی ممکن تھی محیرالعقول واقعات، ناممکن العمل باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ساحر اپنی جھولی میں ہاتھ ڈالتا ہے اور ایک گولا نکال کر ہوا میں اچھالتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ اور خون کی بارش شروع ہو جاتی ہے اور دشمن کی فوج ذرا دیر میں نیست و نابود ہو کر رہ جاتی ہے یا ذرا سی دیر میں بنجر صحرا موجیں مارتے ہوئے دریائے بے کراں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ذرا دیر میں زمان و مکان مل جاتے ہیں، فاصلے مٹ جاتے ہیں اور عمرو اور دوسرے عیار نظر بچا کر اس جگہ جا پہنچتے ہیں جہاں تخیل کی رسائی بھی مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عمرو عیار اور ان کی زنبیل، جادو، سحر اور طلسم، محیرالعقول واقعات تختِ سلیمان، اڑن کھٹولا۔ در اصل انسانی خواہشات کی وہ علامتیں ہیں جن سے نہ صرف وہ مسرت حاصل کرتا ہے بلکہ حیات و کائنات کو اپنے تصرف میں لانے کی آرزو کا اظہار بھی کرتا ہے۔ اب اس نقطۂ نظر سے ان فن پاروں کو دیکھئے تو ان کی دنیا کے نرالے پن اور انسانی خواہشات کے بھرپور ہونے کا شدید احساس ہونے لگتا ہے ——— مفروضہ، عمومیت کا رنگ لے کر، ادیب کے ذہن میں ابھرتا ہے اور برسوں پہلے وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں سائنس قدم قدم پہنچتی ہے۔

اصل میں ادب کے سلسلے میں یہ ساری مایوسی اور بوکھلاہٹ ادب کی ماہیت اور نوعیت نہ سمجھنے کی بناء پر ہے۔ جیسا کہ ایلیٹ نے کہا ہے ادب کا معاملہ تو براہ راست زبان سے ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ اسے محفوظ رکھے اور دوسرے یہ کہ اسے وسعت اور ترقی دے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اس سلسلے میں دوسروں کے احساسات کی ترجمانی بھی کرتا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ اسے بدلتا بھی جاتا ہے اور ہمیں ان احساسات سے زیادہ باخبر بھی کر دیتا ہے جو اب تک دھندلے دھندلے ہمارے شعور کے اندھیروں میں جل بجھ رہے تھے اور ہمیں ان

احساسات کا تجربہ بھی کرا سکتا ہے جن کو ہم نے اس سے پہلے محسوس تک نہ کیا تھا۔ ادب
ادراک و احساس کے نئے نئے انحراف کی تلاش کرتا ہے جنہیں دوسرے اپنے تصرف میں
لا سکتے ہیں اور اسی باخبری اور آگاہی کے ساتھ وہ زبان کو وسعت دے کر اس کے مزاج
میں نئے پن اور زندگی کے نت نئے تجربوں اور تنوع کا رنگ بھرتا رہتا ہے۔ ادب ہمیں
تجربوں کے مفہوم اور پیچیدگی سے باخبر کرتا رہتا ہے۔ اس کا اثر ہمارے اعمال پر بھی
پڑ سکتا ہے۔ ویسے ادب کا یہ کارنامہ کوئی ایسا نیا نہیں ہے۔ جدید ذہن نے سائنس
کی ترقی سے مات کھا کر، صرف اس میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ ادب کے سلسلے میں عمل کے عنصر
کو بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا ہے اور اس میں براہِ راست وہ عناصر تلاش کرنے لگا ہے
جس کا غریب ادب سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ ادیب کا کام یہ تو ہرگز نہیں ہے
کہ وہ پبلک کی حوصلہ افزائی کرے، کسی 'مقصد' کو آگے بڑھانے میں ادب کی چادر لپیٹ
کر پیش پیش رہے یہ سارا جال دراصل سائنس کی افادیت پسندی کا پھیلایا ہوا ہے۔
اتنا ضرور ہے کہ فن کا اثر ہمارے عمل پر پڑتا ہے اور وہ اس لئے کہ وہ ہمارے جذبات کو
اپنی گرفت میں لے لینے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن یہ کام بھی ثانوی درجہ رکھتا ہے۔

ادیب کا پہلا کام تو یہی ہے کہ وہ اپنے اُس معاشرے کے ادراک و خیال، عقیدے
اور تجربے کی مجموعی پیچیدگی سے آگاہ رہے جس سے شعر و ادب پیدا ہوتے ہیں۔ اگر وہ
ایسا نہیں کرتا تو زبان میں ابتدائی صداقت کا فقدان ہو جائے گا اور اشیاء اور الفاظ
کا باہمی رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ اور جب زبان سے یہ چیزیں غائب ہونے لگتی ہیں تو
انسانی کیفیات پر سے بھی اس کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگتی ہے۔ عمل کے امکانات کی لَو
لگانے سے پہلے ضروری ہے کہ انسانی حالت و کیفیت کے عنصر کو درجہ بدرجہ زبان میں شامل
کیا جائے۔ ویسے تو یہ بات سائنس کی افادیت کے مقابلے میں بالکل بے مایہ سی معلوم ہوتی
ہے لیکن اس میں ایک راز اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی زبان میں بڑے فنکار پیدا ہونے

بند ہوجائیں تو اس سے ایک طرف تو یہ ہوگا کہ ہمارے تخیل کا سوت بند ہونے لگے گا اور دوسری طرف زبان کے زوال پذیر ہونے کے ساتھ پوری تہذیب کا شیرازہ بکھرنے لگے گا اور پھر رفتہ رفتہ یہ تہذیب کسی قوی تر تہذیب میں جذب ہوکر ختم ہوجائے گی. بالکل یہی عمل اس وقت ہماری تہذیب کے ساتھ ہورہا ہے. ابھی یہ عمل دبے دبے قدموں ہورہا ہے لیکن جب اس عمل کی جڑیں زمین پکڑ لیں گی تو اس وقت ہم اس کا شدید طور پر احساس کرسکیں گے۔ تہذیب کے کسی قوی تر تہذیب میں جذب ہونے کے بعد ساری ترقیوں کے امکانات محدود ہونے لگتے ہیں اور سائنس کی ترقی بھی اسی کے ساتھ رک جاتی ہے. تاریخ کے اوراق ایسی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں.

ایلیٹ نے اس سلسلے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ اگر ہمارے ہاں ادب کی تخلیق بند ہوجاتے تو اس سے نہ صرف یہ کہ ہم احساس کے تنوّع سے بے خبر ہوجاتے ہیں. ہمارے سوچنے کی راہیں مسدود ہوجاتی ہیں بلکہ ہم ماضی کے ادب سے بھی الگ ہوکر رہ جاتے ہیں تو اس پر اس لئے کہ ادب میں سارا معاملہ تسلسل کا ہے اور تاوقتیکہ ہم اس تسلسل کو برقرار نہ رکھ سکیں ہمارا ماضی ہم سے دور تر ہوتا چلا جائے گا. اور یہاں تک کہ وہ خود ہمارے لئے اتنا ہی اجنبی ہوجائے گا جتنا کسی بدیسی زبان یا قوم کا ادب. وقت کے ساتھ ساتھ طرزِ زندگی اور زبان بدلتی رہتی ہے اور تاوقتیکہ ہمارے پاس چند آدمی ایسے نہ ہوں جو غیر معمولی ادراک و احساس کو لفظوں میں جوڑنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہوں تو پھر رفتہ رفتہ نہ صرف ہمارے اظہار بلکہ محسوس کرنے کی صلاحیت بھی زوال پذیر ہوجاتی ہے. ادب کا معاملہ ایسا ہے کہ وہ پوری قوم کے بولنے کی قوت اور ادراک کو متاثر کرتا ہے.

بہرحال ادراک و احساس کا جہاں تک تعلق ہے وہ ادب ہی میں نمودار ہوتا ہے. ادب انسان کی داخلی کائنات کا اظہار ہے جس پر خارجی عوامل کی پوری چھوٹ پڑتی رہتی ہے اور اس میں خارجی عوامل اس طور پر ملے جلے ہوتے ہیں کہ آپ اس دھوپ چھاؤں میں کہیں بھی

انگلی رکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں چیز یہاں ہے. اس میں احساسات کے نئے جلوے، زندگی کے نئے زاویئے، کائنات کو سمجھنے کے نئے طریقے، نامعلوم حقیقتوں کے اظہار کے نئے قرینے، ادراک کی غیر محسوس کیفیتیں، دلوں کے دبے دبے غم، آرزوئیں، حسرتیں اور خواہشیں اظہار پاتی ہیں.

سائنس کی طرح ادب میں بھی اہمیت اضافی صداقت کی نہیں ہوتی بلکہ اس مسرت کی ہوتی ہے جو اس کے ذریعے ہمیں حاصل ہوتی ہے. ادب کے سلسلے میں ایک بنیادی بات یہ بھی ہے کہ وہ مسرت بہم پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے. سائنس نہ تو ادب کی دشمن ہے اور نہ ادب کو اس سے کوئی خدا واسطے کا بیر ہے. جب ادیب کسی موضوع یا مسئلے پر غور کرے گا ظاہر ہے کہ اس کا شعور و احساس الگ الگ نہیں رہ سکتے، تو اس پر سائنٹیفک رنگ ڈھنگ اور تصور کا اثر ضرور پڑے گا کیونکہ یہ فضا بھی ہماری اسی تہذیبی فضا کا ایک حصہ ہے جس میں ہم سانس لے رہے ہیں. فن کار کی حیثیت سے جب کبھی وہ سوچے گا، اپنی صورتِ حال کی نوعیت اور زندگی کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرے گا تو اسے جدید احساسات کے اظہار کے لئے سائنس کا سہارا لینا ہوگا. اور اس سہارے سے اس کے اظہار کے ذرائع، ساخت اور مزاج پر اثر پڑنا ضروری ہے. مثال کے طور پر ہم ان اثرات کو رلکے کے نوحوں، ایلیٹ کی شاعری، جیمس جوائس، کافکا اور پروست کے ناولوں میں دیکھ سکتے ہیں. ریڈیو اور فلم وغیرہ نے ہمارے انداز پر کس طرح سے اثر ڈالا ہے یہ بھی کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے. تخلیقی روح تاریکی میں تو ٹامک ٹوئیاں مارنے سے رہی. کوئی بھی ادیب جب تک اپنے جذبات کو معروضی رنگ میں نہیں دیکھ لے گا وہ فن کارانہ طور پر اس کا استعمال نہیں کر سکتا. زندگی کا ذاتی PATTERN بھی اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب فن کار اپنے ماحول سے پورے طور پر باخبر ہو، اس کا شعور رکھے اور یہ PATTERN اس لئے زیادہ مکمل بھی ہوگا کہ اس میں انسان کی

ذات اور احساس راہ پاتے ہیں۔ سائنس کی ترقی اور اس کے نو بہ نو انکشافات میں نہ جذبات ہوتے ہیں، نہ احساس اور نہ جمالیاتی پہلو۔ ادب ان میں یہ رنگ بھر دیتا ہے۔ ان میں اپنی انفرادیت و معنویت رسا بسا کر نئی زندگی بخشتا ہے جو رفتہ رفتہ ہمارے عام شعور کا ایک حصّہ بن جاتی ہیں اور پھر ہم سائنس کے انکشافات اور اثرات کو زندگی کی دھڑکنوں، احساس کی قوتوں، ادراک و جذبات کی توانائیوں، خواہشوں اور ارمانوں کے رنگ میں دیکھنے لگتے ہیں۔ سائنس فن کار کے دماغ میں وہی گُل کھلا سکتی ہے، وہی ہلچل مچا سکتی ہے جو عمل قاری کے ذہن پر فن کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسوں میں بھی جیولوجی اور حیاتیات نے ادب پر زیادہ اثر ڈالا ہے اور جنہیں ٹی۔ ای۔ ہیوم ملی جلی سائنس، کا نام دیتا ہے۔ فن کار اسی حد تک سائنس کا دشمن ہو سکتا ہے کہ وہ دنیا کے بارے میں معروضی رویہ اختیار نہیں کر سکتا اور کسی ایسے فارمولے کو قبول نہیں کر سکتا جس کی زندگی اس تجربے کے صحیح ہونے تک محدود ہوتی ہے۔ سائنس کی معروضیت اور فطرت کی ذہنی معرفت کے لئے حسّاس فرد کی داخلیت اور جبلّی ادراک میں جذب ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ سب سے بڑی صداقت یا حقیقت انسان کی ذات ہے۔ سائنس کے انکشافات، زمان و مکان کے نئے تصورات، دنیا کے حالات و کوائف کی خبریں انسان کو اپنی ذات کے عرفان میں مدد دے سکتی ہیں اور اس سے ذات کے نئے نئے پہلو، نئی وسعتیں اور فضائیں سامنے آسکتی ہیں۔ نئے انسانی رشتے، جسمانی و روحانی تعلقات پیدا ہو سکتے ہیں اور جس سے نیا ادراک، نیا احساس و جذبہ وجود میں آسکتا ہے اور جس کا اثر نہ صرف مزاجوں پر پڑ سکتا ہے بلکہ فکر و اظہار پر بھی۔ ذات کا یہی عرفان ممکن ہے اس بے عقیدگی کے دور میں کسی نئے عقیدے کا پیش خیمہ ثابت ہو (مذہب کا لفظ میں یہاں جان بوجھ کر استعمال نہیں کر رہا ہوں) جس میں جمالیات و اخلاقیات مل جل کر ایک ہو جائیں جس میں اساطیر ہوں، فنکار ہو اور جس کا ایک خدا بھی ہو ــــ سائنس کے اس دور میں ادب کو وسعت کے بجائے مرکز کی

تلاش ہے اور یہ مرکز نئی نسل کے لئے 'ذات کا عرفان' ہی ہو سکتا ہے۔

رہا ابلاغ کا مسئلہ تو وہ شعور کے بجائے رمز و کنایہ اور اساطیر سے پورا ہو سکتا ہے۔ اساطیر کے متعلق اب تک ہمیں یہ غلط فہمی رہی ہے کہ یہ زندگی کی سخت کوشیوں، تلخ حقائق سے انحراف کے طور پر تفریح طبع یا سستانے کا ایک راستہ ہے۔ یہاں رچرڈز کا حوالہ دینا بے محل نہیں ہوگا جس کا یہ کہنا ہے کہ اساطیر تو بذاتِ خود ٹھیٹ حقائق کی قلب ماہیت ہیں۔ وہ تو ان کی رموزی معرفت اور ان کو تسلیم کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ اگر انسان کے پاس اپنی اساطیر نہ ہوں تو وہ ایک درندہ بن کر رہ جاتا ہے جس کے پاس نہ روح ہوتی ہے، نہ کوئی مقصد اور نہ کوئی ترتیب یا نظام بلکہ وہ امکانات کا ایک ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ادب کوئی مصدقہ سائنس کی دنیا نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ مکمل ہے۔ تکمیل کا یہ نظام تخیل کے عظیم کارناموں کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ اس بات کو یوں دیکھئے کہ ایک بھی شخص ایسا نہیں ہے، جو سائنس کے کسی بھی تجربہ کو اپنے اندر محسوس کر سکے حالانکہ وہ مکمل ہونے کا دعویٰ کرتی ہے لیکن برخلاف اس کے حافظ کی شاعری، فردوسی کا شاہنامہ، میر کے تیکھے اشعار، اقبال کی مسجد قرطبہ یا ہیملٹ کی جامعیت کوئی تجربی نوعیت کی نہیں ہے بلکہ اس کا نظام فنکار کے داخلی تجربے، احساس اور جذبے کی شدت اور اظہار کی قوی گرفت کی وجہ سے ہے جسے ہم اساطیر کا نام دے سکتے ہیں۔

اس وقت یہ جو کچھ بے ترتیبی اور انتشار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اب ہم نہ شدت کے ساتھ محسوس کر سکتے ہیں اور نہ شدت کے ساتھ سوچ سکتے ہیں بس احساس کمتری کے مُردے کو اپنے سینوں سے چمٹائے پھرتے ہیں۔ تہذیبی صحت یا بیماری کو نظر انداز کر دیا ہے اور ذات کی اتھاہ گہرائیوں اور امکانات کو بُھلا بیٹھے ہیں، جو دراصل تخلیق کے سلسلے میں مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس وقت ہمارے ہاں جو ادب کی تخلیق رُک سی گئی ہے یہ ایسی بات نہیں ہے جسے آسانی کے ساتھ نظر انداز کر دیا جائے اور صرف رونے

دھونے سے غم ہلکے کر لئے جائیں بلکہ یہ ایک ایسی وبا کی ابتدا ہے. جو دیکھتے ہی دیکھتے ساری تہذیب، قوم اور معاشرہ کو اپنے دامن میں سمیٹ لے گی. ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر مجھے یہ بتایا جائے کہ نارویجین زبان میں شاعری کی تخلیق رک گئی ہے (حالانکہ میں نارویجین شاعری کا براہ راست مطالعہ نہیں کر سکتا) تو مجھے فیاضانہ ہمدردی سے زیادہ اس خطرہ کا احساس ہوگا جو وبا کی شکل میں سارے یورپ کو اپنے دامن میں سمیٹ لے گا. یہ لوگوں کے قوتِ اظہار اور احساس کو روک دے گا. اس لئے کہ جب تہذیب صحت مند ہوتی ہے تو اس کے بڑے شاعروں کے پاس اپنے ہم وطنوں کے لئے تعلیم اور کلچر کی ہر سطح پر کہنے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے. اس معیار پر اس وقت اگر ہم اپنی تہذیب، شاعری اور ادب کا اندازہ کریں تو ہمیں نئی نسل کی بوکھلاہٹ، اضمحلال، اور مایوسی کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے. حالانکہ صرف بوکھلاہٹ سے تو کام چلتا نہیں ہے. ضرورت یہی ہے کہ تہذیب کی اقدار کی تشکیلِ نو کی جائے، ان کی ٹوہ لگائی جائے اور یہ کام صرف ادب کے ذریعے ہو سکتا ہے. کوئی دور زوال پذیر نہیں ہوتا بلکہ صرف افراد ہوتے ہیں. تجربے کے مدوجزر کا سلسلہ جاری رہنا چاہیئے اس لئے کہ ادب کی سب سے بڑی دشمن بے زاری اور اکتاہٹ ہے. گزشتہ دس سال میں جو کچھ ہوا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ سفر کرنے کی خاطر سفر کرنے والے، حقیقی مسافروں کا کال پڑ گیا ہے معیار اور علمیت ہماری تنقیدی تحریروں سے مفقود ہو گئے ہیں. ہم اپنے ماضی سے رفتہ رفتہ الگ ہوتے جا رہے ہیں، ذات پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے. زبان کو وسعت اور ترقی دینے کی طرف سے ہم بے توجہ ہو گئے ہیں اور اس طرح احساس کی صلاحیت کو ہم گنوا رہے ہیں. ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں اس سے پورے طور پر باخبر نہیں ہیں کسی بات پر جھگڑا کرنے، اختلاف کرنے، بحث و مباحثہ کرنے کی اہلیت کھو رہے ہیں اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم شدت کے ساتھ اپنے عقیدہ کی تعمیر نہیں کرتے، ایسے عقیدے کی جس پر ہمارا پورا ایمان ہو، جس پر ہم نے کچھ سوچا ہو، جس سے اگر دوسرے اختلاف کریں تو ہم اپنے

عقیدے کے جواز میں دلائل دے سکیں۔ فرانس انیسویں اور بیسویں صدی میں ادبی تحریکات کا مرکز رہا ہے۔ وہاں کے ادیب جو کچھ لکھتے ہیں باخبر رہ کر لکھتے ہیں، وہ پہلے سے تنقیدی فارمولا بنا لیتے ہیں اور وہ ادیب جو ان پر ایمان رکھتے ہیں شعوری طور پر اپنی تخلیقات کی بنیاد انہی فارمولوں کو بناتے ہیں اور یہ فارمولے بنیاد ہونے کے باوجود ان کے تخلیقی PATTERN پر پابندی عائد نہیں کرتے۔ اس میں ادیب آزاد رہتا ہے اسی لئے اتنے بہت سارے مینی فیسٹو، ادبی تحریکیں اور بحث و مباحثے ان کے ہاں نظر آتے ہیں اور ان کے ہاں تخلیقی کام جاری رہتا ہے۔ ہمیں بھی اب کسی ایسے ہی تنقیدی نظریے کی ضرورت ہے، ایک تحریک کی ضرورت ہے، ایک فارمولے اور عقیدے کی ضرورت ہے جس میں روحِ عصر بھی ہو اور آنے والے زمانوں کا شعور بھی۔

ممکن ہے جو کچھ میں نے کہا ہے اسے آپ پسند نہ کریں۔ لیکن اب معاملہ صرف ذاتی پسند و ناپسند کا نہیں ہے بلکہ اچھا برا، صحیح غلط اس سلسلے میں جو کچھ بھی ہم سوچیں اسے تحریری شکل میں سامنے لائیں تاکہ بات آگے چلے۔ نئی نسل نے، اختلاف اور حجت کو بھلا دیا ہے جس سے بات میں سے بات نکلتی ہے اور دھندلکوں میں روشنی کی کرن نظر آنے لگتی ہے اور کہر آلود فضا میں لڑنے جھگڑنے اور چیخنے چلانے سے شکلیں بھی نظر آنے لگتی ہیں۔ فرانس پر جب نازیوں کا تسلط ہوا تو ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ادیبوں کی زبانوں پر تالے پڑ گئے۔ ایک شخص دُرولا روشیل نامی نازیوں کی طرف سے تبصرہ کرتا تھا اور اس میں ان ادیبوں کی تذلیل کرتا تھا جو زبان بندی کے اسیر تھے، جو سُن تو سکتے تھے مگر جواب نہ دے سکتے تھے۔ کچھ دن تک تو یہ سلسلہ جاری رہا لیکن جلد ہی اس کی تحریروں میں بے چینی اور بے اطمینانی جھلکنے لگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا لکھنا بند ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا خطاب ان لوگوں سے تھا جو پلٹ کر جواب نہیں دے سکتے تھے جو اُس سے اختلاف نہیں کر سکتے تھے۔ آپ صحرا میں

بیٹھ کر بھلا کیا لکھ سکتے ہیں اور کیا بول سکتے ہیں۔ یہی رویہ آج کل نئی نسل کا ہو گیا ہے جب لکھنے والے کو یہ احساس ہونے لگے کہ کسی نے اس کی بات سے اختلاف نہیں کیا ہے۔ اس کی بات کو شاید سُنا نہیں ہے تو آخر وہ کب تک لکھے گا؟ اگر نئی نسل نے ایسے ہی چُپ سادھے رکھی تو پھر اس کا خدا ہی حافظ ہے۔

(۱۹۵۸ء)